لفظ

(نظمیں اور غزلیں)

آل احمد سرور

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل حکومت ہند
ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-066 110

لفظ

(نظمیں اور غزلیں)

آل احمد سرور

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل حکومتِ ہند
ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

Lafz

by

Al-e-Ahmad Suroor

سنہ اشاعت : اکتوبر، دسمبر 2005 شک 1926

پہلا ایڈیشن : 1100

قیمت : -/64 روپے

سلسلۂ مطبوعات : 1243

ISBN:81-7587-112-1

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای۔میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی

پیش لفظ

قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت قدیم اور جدید عہد کے شاعروں اور نثر نگاروں کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی وادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے بلکہ زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

پروفیسر آل احمد سرور کا شمار اردو کے دیدہ ور نقادوں میں ہوتا ہے مگر وہ ایک نغز گو شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری ماضی کے اکتسابات کی حامل، حال کے میلانات کی ترجمان اور مستقبل کے امکانات کی نقیب ہے۔ ان کی زندگی میں ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے ''سلسبیل''، ''ذوقِ جنوں'' اور ''خواب اور خلش''۔ اردو زبان وادب کو سرور صاحب کی جو دین ہے، اس سے کما حقہ واقفیت کے لیے ان کے نثری کارناموں ہی سے نہیں، ان کے شعری کمالات سے بھی شناسائی ضروری ہے۔ زیرِ نظر مجموعۂ کلام ''لفظ'' سرور صاحب نے اپنی زندگی میں مرتب کرلیا تھا جسے شائع کرنے کا فخر قومی اردو کونسل کو حاصل ہو رہا ہے۔ امید ہے باذوق قارئین اس کا پُر جوش خیر مقدم کریں گے۔

ایس۔ موہن
ڈائرکٹر انچارج

انتساب

زاہدہ سرور کے نام

فہرست

دیباچہ

پروفیسر آل احمد سرور (1911 تا 2002) نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اوراس سے پہلے ترقی اردو بورڈ کے قیام، استحکام اور ارتقا کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ ترقی اردو بورڈ کے نائب چیئرمین بھی ایک طویل مدت تک رہے۔ لہٰذا اس بات سے قطع نظر کہ سرور صاحب جدید اردو ادب کے غیر معمولی خدمت گذار اور اس کے دھارے کو متعین کرنے میں ایک انتہائی موثر قوت کا حکم رکھتے تھے، قومی اردو کونسل پر ان کا قرض یوں بھی واجب الادا ہے کہ انھوں نے سالہا سال تک ترقی اردو بورڈ اور قومی اردو کونسل کی اعزازی اور بے ریا خدمت کی۔ ان کی مخلصی اور بے ریائی کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ترقی اردو بورڈ یا قومی اردو کونسل نے ان کی کوئی کتاب نہیں چھاپی اور نہ ہی کبھی انھوں نے اس بات کی فرمائش کی، یا اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان کی کوئی کتاب بورڈ یا کونسل کی طرف سے شائع ہو۔ ہر چند کہ ان کی کئی اہم کتابیں ایک مدت سے بازار میں نایاب ہیں اور ان کے مضامین کے بھی کئی مجموعے مرتب کر کے نئی کتاب کی شکل میں شائع ہو سکتے تھے، لیکن سرور صاحب ان چند لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنے کام سے کام رکھا اور نہ ستائش کی تمنا کی اور نہ صلے کی پروا۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا، سرور صاحب کے تنقیدی مضامین کے کئی پرانے مجموعے جو ادبی کلاسیک کا درجہ رکھتے ہیں اب بازار میں دستیاب نہیں ہیں۔ لہٰذا قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک منصوبے پر غور کرے گی جس کے تحت نہ صرف سرور صاحب بلکہ ان کے دیگر معزز معاصرین مثلاً احتشام حسین، کلیم الدین احمد کی بھی منتخب کتابیں دوبارہ شائع کی جائیں۔ زیرِ نظر کتاب اس منصوبے کا جز نہیں ہے، بلکہ ایک طرح سے ایک چھوٹی سی کوشش ہے کہ سرور صاحب کو قومی اردو کونسل کی طرف سے خراجِ عقیدت پیش کیا جائے۔ سرور صاحب نے آخری چند برسوں کا

کلام خود یکجا اور مرتب کیا تھا۔ ان کی صاحبزادی محترمہ مہ جبیں جلیل نے کونسل کے سامنے تجویز رکھی کہ اسے شائع کر دیا جائے۔ کونسل اس کو شائع کر کے خوشی محسوس کر رہی ہے۔

سرور صاحب کا ایک مجموعۂ کلام ''سلسبیل'' کے نام سے مدت گذری شائع ہوا تھا اور اسے اس زمانے کے اربابِ نظر نے تحسین و ستائش کا مستحق قرار دیا تھا۔ کئی سال بعد ان کا دوسرا مجموعہ ''ذوقِ جنوں'' شائع ہوا۔ ان کا تیسرا مجموعہ ''خواب اور خلش'' کے نام سے ان کے آخری زمانے میں چھپا۔ اس کے بعد بھی سرور صاحب نے شغلِ شعر و سخن جاری رکھا لیکن بہت کم۔ ان کی تنقیدی، تعلیمی اور ادارہ جاتی مصروفیات آڑے آتی رہیں اور ان کی شعر گوئی کی رفتار دھیمی پڑتی گئی۔

آخری عمر میں انھوں نے مجھ سے اور بعض اور لوگوں سے کہا تھا کہ وہ ''سلسبیل''، ''ذوقِ جنوں'' اور ''خواب اور خلش'' کا نیا ایڈیشن اور بعد کے کلام کا انتخاب منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ انتخاب نہیں بلکہ کلیات کا اہتمام کرنا چاہیے۔ لیکن بات آئی گئی ہو گئی۔ طویل بیماری نے انھیں نیا مجموعہ یا انتخاب مرتب کرنے کی مہلت نہ دی۔ ان کی کئی نظمیں جو میں نے ''شب خون'' میں شائع کی تھیں بہت مقبول ہوئی تھیں اور ان کے انداز و اسلوب سے پتہ لگتا تھا کہ سرور صاحب کی شاعری نئے خیالات اور نئے طرزوں کو بھی پوری طرح انگیز کر رہی ہے۔

ہمارے دوسرے بڑے جدید نقادوں کی طرح سرور صاحب کے ساتھ بھی یہ زیادتی ہوئی کہ ان کے تنقیدی افکار کے سامنے ان کی شعر گوئی کو کم اہمیت کا حامل قرار دیا گیا۔ ورنہ اگر دیکھا جائے تو جدید اردو شاعری میں بھی آل احمد سرور کا نام نمایاں جگہ کا مستحق قرار پاتا ہے۔ زبان کے تئیں ان کا رویہ نہایت سلیس و نفیس تھا اور ان کی شاعری کا مجموعی رجحان معاصر فکری میلانات کو جذب کرتے ہوئے سنجیدہ جذبات کے اظہار کی طرف مائل تھا۔ آج کے زمانے میں جب بہت ساری شاعری سرسری بیان پر قناعت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، آل احمد سرور کی شاعری کا مطالعہ نوجوان شعرا اور ادب کے طالب علموں کے لیے سود مند ثابت ہوگا۔

شمس الرحمٰن فاروقی

کچھ اس مجموعے کے بارے میں

یہ میری شاعری کا چوتھا مجموعہ ہے۔ جو تیسرے مجموعے خواب و خلش کے دس سال بعد شائع ہو رہا ہے۔ اس میں نظموں اور غزلوں کی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ بعد کی نظمیں پہلے آتی ہیں۔ چنانچہ آخری نظم جس کا عنوان لفظ ہے سب سے پہلے ہے۔ بعض نظمیں دراصل تیسرے مجموعے کی اشاعت کے وقت شامل ہونے سے رہ گئی تھیں۔ اب انھیں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ غزلوں کے سلسلے میں اب یہ اندازہ ہوا ہے کہ ''خواب اور خلش'' میں جو غزلیں شامل ہیں ان میں سے کئی نامکمل ہیں۔ اور کچھ غزلیں ایسی ہیں جن کے دو یا دو سے زیادہ شعر شامل ہونے سے رہ گئے تھے اس لیے ان کو اس نئے مجموعے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جن غزلوں کا صرف ایک شعر ہی چھوٹا تھا ان کو متفرق اشعار کے ذیل میں شامل کیا گیا ہے۔

اپنی شاعری کے متعلق میرا رویہ عجیب ہے۔ نثر کے نخلستانوں میں بہت خاک اڑانے کے باوجود شاعری مجھ سے چھوٹ نہ سکی۔ کوئی واقعہ، کوئی کرشمہ، فطرت کا کوئی منظر، حسن کا کوئی جادو، انسانی فطرت کا کوئی عجوبہ مجھے متاثر کرتا رہا، اور میں شعر کہتا رہا۔ میں نے نظمیں بھی کہی ہیں، اور غزلیں بھی۔ ان میں زیادہ تر پابند نظمیں ہیں لیکن کچھ آزاد نظمیں بھی ہیں۔ غزلوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا ہے۔ اگرچہ تعداد میں نظمیں غزلوں سے کم ہیں مگر بعض نظمیں اہم اور قابل قدر سمجھی جائیں گی۔ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے مشاعروں میں کم ہی شریک ہو سکا۔ رسالوں کی فرمائش پر البتہ کچھ غزلیں ان کی نذر کر دیں۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ اگر کسی شخص کی شہرت ایک میدان میں ہو جاتی ہے تو دوسرے میدان میں اس کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ میرا نام نثر کے سلسلے میں چل نکلا تو

یارلوگوں نے میری شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دی اردو تنقید میں یہ سہل پسندی اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔اس کا شکوہ کرنا بیکار ہے۔اس کا مجھے احساس ہے کہ میں نے اپنی شاعری کو وہ اہمیت نہیں دی جس کی وہ متقاضی تھی۔

آج شاعری کا کیا رول ہے اور کیا شاعری موجودہ دور میں انسانی ذہن کی وہ ترجمانی کرسکتی ہے جو اب تک اس نے کی ہے۔میرا خیال ہے کہ یونانی دور کی طرح شاعری کے ذریعہ سے ریاضی، جغرافیہ اور سائنس کے عقدے حل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔لیکن شاعری انسانی شعور کو متاثر کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔شعر کے ذریعہ سے اقلیدس منظوم نہ کی جائے گی مگر بقول حالی شاعری کے ''حیرت ناک جلووں سے انسان کے ذہن کو روشنی اور گرمی ملتی ہے اور ملتی رہے گی۔اس اعتراف میں مجھے کوئی پس وپیش نہیں ہے کہ میں غزل یا نظم میں سے کسی ایک کا قائل نہیں ہوں۔ بلکہ دونوں کے حسن کو مانتا ہوں۔غزل کو شاعری کی کل کائنات سمجھنے یا غزل کی گردن مارنے کے خلاف ہوں۔

شاعری میں نظم اور غزل دونوں کی اہمیت ہے۔ ہاں نظموں پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔غزل پر توجہ کے ساتھ ساتھ نظم کے امکانات اور اس کی وسعتوں کا بھی احساس ہونا چاہیے۔ شاعری میں اشاروں کی قدر و قیمت مسلم ہے۔بقول اکبرالہٰ آبادی:

تفصیل نہ پوچھ ہیں اشارے کافی
یونہی یہ کہانیاں کہی جاتی ہیں

لیکن وضاحت،صراحت، تفصیل اور تنظیم کا بھی ایک حسن ہوتا ہے۔جسے غزل کی مقبولیت نے اکثر نظرانداز کیا ہے۔میں یہاں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ'' خواب اور خلش'' کے پیش لفظ میں موجودہ ذہن کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسے دوہرادیا جائے۔بعض باتوں کو دوہرانے میں کوئی حرج نہیں۔

آزادی کے بعد ہماری زندگی خاصی پیچیدہ ہوگئی ہے۔اب ماضی کی سادہ نگہی سے کام نہ چلے گا،ہم نے آزادی سے پہلے جو خواب دیکھے تھے آج ان کی شکست دیکھ رہے ہیں۔بلاشبہ بعض

اہم شعبوں میں ہم نے بڑی ترقی کی ہے، مگر غور سے دیکھا جائے تو اس ترقی کی بہت بھاری قیمت بھی ادا کر رہے ہیں۔ حقوق پر سب زور دیتے ہیں۔ فرائض کا کسی کو احساس نہیں۔ جمہوریت کے معنی اکثریت کی آمریت کے ہوتے جارہے ہیں۔ زندگی کی اعلیٰ قدروں کی پامالی ہوتی جارہی ہے اور صرف مادی ترقی کی دھن میں صارفیت کا مسلک مقبول ہے۔ اس صورتِ حال کی سب سے زیادہ ذمہ داری تو اربابِ سیاست پر ہے، مگر دانشوروں کی خاموشی یا اس دیوانی دوڑ میں شرکت بھی کم نہیں۔

پیسے کی پرستش نے اپنی تہذیب، اپنی تاریخ، اپنے شعر و ادب، اپنی حسن کاری سے بیگانہ کر دیا ہے۔ شہروں کی طرف اندھی دوڑ نے فطرت سے قرب کی دولت چھین لی ہے۔ جوہری بم کا خطرہ کیا کم تھا کہ ماحول کی آلودگی اور فطرت کے ذخیروں کے بے دریغ استعمال کی وجہ سے پوری انسانی زندگی کے خاتمے کے امکانات بھی نظر آرہے ہیں۔ ایسے میں لمحے کی مسرت اور سستی سیاست کو فروغ ہو تو تعجب کی کیا بات ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ پر زور دینے میں غلطی نہیں ہوئی۔ غلطی ان کے برتنے میں ہوئی۔ ''ہم سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے کی دھن میں رہے اور زندگی کی شب تاریک، تاریک تر ہوتی رہی''۔ ایسے میں شاعر اس دکھی انسانیت اور اس مجروح شخصیت کی ترجمانی نہ کرے تو کیا کرے۔ اردو کے شاعر پر تو اور بھی پیمبری کا وقت پڑا ہے۔ اس کی زبان کی بقا خطرے میں ہے۔ اس کے چلن پر رکاوٹیں ہیں۔ حکومت بے پروا ہے اور ایک بڑا حلقہ جس کے پاس طاقت بھی ہے اس کے درپئے آزار ہے، خود اردو والوں کا حال یہ ہے کہ گھر میں آگ لگی ہے اور وہ نیرو کی طرح بانسری بجارہے ہیں۔ انھیں یہ احساس کب ہوگا کہ زبان نہیں تو ذہن نہیں اور ذہن نہیں تو زندگی نہیں۔

شاعری ذات سے کائنات تک کا سفر ہے۔ یہ خوابوں کے ذریعۂ حقائق کی توسیع کا نام ہے۔ یہ لفظ پر فتح کا، اسے نیا غسل دے کر تازہ کاری اور لالہ کاری کرنے کا دوسرا نام ہے۔ انجیل مقدس میں آیا ہے کہ'' پہلے لفظ تھا اور لفظ ہی خدا کے ساتھ تھا اور لفظ خدا تھا''۔ میں لفظ کی حفاظت اس کی

اشاعت اوراس کی رسالت پر اس لیے زور دے رہا ہوں کہ اس کے بغیر زندگی میں روشنی ہوگی نہ گرمی۔ نہ نئی منزلوں کی تڑپ ہوگی، نہ پرانے سفر کے تجربات کا سرمایہ، نہ صداقت ہوگی نہ حسن نہ خیر، زندگی ایک اندھی گلی میں آنکھ بند کر کے دیوانوں کی دوڑ بن جائے گی۔ کاش ہمارا شاعر سستے نشے اور سستی مقبولیت سے بلند ہو کر لفظ کے ذریعہ سے ذہن کو اور ذہن کے ذریعے سے زندگی کو اس پٹری پر واپس لا سکے جس سے وہ اتر گئی ہے۔

یہ مجموعہ میری علالت کے زمانے میں مرتب ہوا۔ اس سلسلے میں، میں عزیزی ابوعبیدہ کی اعانت کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مسودے کو صاف کرنے کا کام بڑی جانفشانی سے انجام دیا ہے۔ پھر بھی اگر مسودے میں کچھ غلطیاں رہ گئیں ہوں تو ان کی ذمہ داری مجھ پر ہے ان پر نہیں۔ چونکہ ضعف بصارت کی وجہ سے اپنے اشعار خود نہیں پڑھ سکتا اس لیے میں ان کی صحت سے مطمئن نہیں ہوں۔

آل احمد سرور
دسمبر 2001
علی گڑھ

لفظ

لفظ وہ برف ہے جو چھونے سے پگھل جاتی ہے
لفظ وہ مے ہے جو مینا سے اچھل جاتی ہے

بوند جو پھول کی پیالی سے پھسل جاتی ہے
طبع سادہ جو کھلونوں سے بہل جاتی ہے

لفظ شاعر کے تخیل کو کہاں پاتا ہے
لفظ جذبے کے تموّل کو کہاں پاتا ہے

لفظ طوفاں کے تجمل کو کہاں پاتا ہے
لفظ جینے کے تسلسل کو کہاں پاتا ہے

لفظ وہ جھاگ جو شیشے سے چھلک جاتا ہے
لفظ وہ قطرہ جو پینے سے ٹپک جاتا ہے

لفظ وہ شعلہ جو اٹھتے ہی بھڑک جاتا ہے
لفظ وہ سانس جو سینے میں اٹک جاتا ہے

لفظ میں گرمی انفاس کہاں سے آئے
میری رنگینی احساس کہاں سے آئے

کاغذی پھول میں بو باس کہاں سے آئے
سنگ میں تابش الماس کہاں سے آئے

لفظ ناقص ہے ادھورا ہے تہی مایہ ہے
لفظ خود بات نہیں بات کا پیرایہ ہے

لفظ روشن نہیں ایک عکس ہے اک سایہ ہے
کون کہتا ہے کہ یہ لفظ گراں مایہ ہے

یہ میری فکر کا اعجاز کہاں لفظ میں ہے
یہ میرے ذہن کی پرواز کہاں لفظ میں ہے

یہ میری بات کا انداز کہاں لفظ میں ہے
یہ میرا سوز میرا ساز کہاں لفظ میں ہے

کربلا کا جو الم ہے وہ کہاں لفظ میں ہے
جو میری روح کا غم ہے وہ کہاں لفظ میں ہے

جو زمانے کا ستم ہے وہ کہاں لفظ میں ہے
اور جو یادوں کا کرم ہے وہ کہاں لفظ میں ہے

کسی کافر کی جوانی کہیں لفظوں مین کھنچ آئے
کسی دریا کی روانی کہیں لفظوں میں کھنچ آئے

یہ مرا سیل معانی کہیں لفظوں میں کھنچ آئے
میرے اشکوں کی کہانی کہیں لفظوں میں کھنچ آئے

لفظ کو آج بھی کچھ لوگ خدا کہتے ہیں
ہم دعا تو نہیں ہاں حرفِ دعا کہتے ہیں

دور سے آتی ہوئی ایک صدا کہتے ہیں
اور تخلیق کی بس ایک ادا کہتے ہیں

جلوۂ شمع ہے کچھ پردۂ فانوس کچھ اور
شاعری اور ہے گنجینۂ قاموس کچھ اور

اور سرخاب کا پر ہے، پر طاؤس کچھ اور
کچھ ہے فطرت کا لباس ان کا ہے ملبوس کچھ اور

لفظ کب روح کی فریاد و فغاں تک پہنچے
لفظ کب جسم کے اسرار نہاں تک پہنچے

لفظ کب معرفت حسن تپاں تک پہنچے
کب کمند اپنی کسی کا ہکشاں تک پہنچے

کوئی تصویر مکمل نہیں ہوتی یارو
کوئی پرواز مسلسل نہیں ہوتی یارو

بھاپ ساری کبھی بادل نہیں ہوتی یارو
خون کی بوند کبھی حل نہیں ہوتی یارو

نیم کش تیر میں بھی ایک خلش ہے تو سہی
گرتے پڑنے میں بھی چلنے کی روش ہے تو سہی

یہ جو سایہ ہے کچھ اس میں بھی تپش ہے تو سہی
نقش میں اپنے مصور کی کشش ہے تو سہی

گرد رہ بھی تو مسافر کا پتہ دیتی ہے
منزل قافلۂ شوق بتا دیتی ہے

مطبوعہ 2000

❖❖❖

نظم اور غزل

نظم محیطِ بے کراں اور غزل ہے اک سبو
نظم ہے جسم کائنات اور غزل رگِ گلو
یہ ہے جہانِ آرزو وہ ہے فغانِ آرزو

❖❖❖

یہ ہے مصور حیات، وہ ہے مغنیٔ حیات
نظم صفات کا شعور اور غزل شعورِ ذات
ایک نظر کی واردات، ایک لہو کی واردات

❖❖❖

فکر کا کوئی بھی افق، دل کا کوئی بھی ماجرا
آنکھ کا کوئی بھی طلسم، درد کا کوئی سلسلہ
دیدہ وری کا کوئی نقش، روح کا کوئی مسئلہ

❖❖❖

شعر فلک پہ جست بھی، شعر زمیں کا ساز بھی
شعر چمن کی سیر بھی، شعر کلی کا راز بھی
عقل کی اک داستاں، عشق کی اک نماز بھی

❖❖❖

شعر طلوعِ جام بھی، قصۂ ناتمام بھی
شعر سحر کا نور بھی، شعر فسونِ شام بھی
شعر ہے وقت کی پکار لمحۂ تیز گام بھی

❖❖❖

زیست کا کوئی تجربہ، شوق کی کوئی بھی کرن
حسن کی کوئی بھی ادا، عشق کا کوئی بانکپن
خم ہو، سبو ہو جام ہو، کیف کی کوئی انجمن

❖❖❖

غالب و میر بھی مرے، اور نظیر بھی مرے
مرے جگر بھی ترجماں، جوش سفیر بھی مرے
عشق کی تیغ بھی مری، حسن کے تیر بھی مرے

❖❖❖

فن کی بساط کائنات، فن کبھی گوشۂ حیات
فن کبھی سیر شش جہاں، اور کبھی دو دلوں کی بات
فن کبھی ولولوں کا دن فن کبھی دل جلوں کی رات
فن ہے مصورِ حیات، فن ہے مغنیٔ حیات

اگست 1993

❖❖❖

میں بھی زندہ ہوں

بچوں کی معصوم ادائیں جب تک دل کو لبھاتی ہیں
کالی گھٹائیں دھرتی پر رس کی بوندیں ٹپکاتی ہیں
شوخ نگاہیں ان کی جب تک دل میں دیپ جلاتی ہیں
تب تک میں بھی زندہ ہوں
جب تک کلیاں کھلتی ہیں خوشبوئیں پھیلاتی ہیں
جب تک چڑیاں آتی ہیں اوراپنی دھن میں گاتی ہیں
اوس میں ڈوبی چاند کی کرنیں جب تک دل بہلاتی ہیں
تب تک میں بھی زندہ ہوں
جب تک خواب بھلے لگتے ہیں، درد کی دولت باقی ہے
جب تک مے خانہ آباد ہے، لطف چشم ساقی ہے
جب تک میرے ذہن رسا میں تیغ کی سی براتی ہے
تب تک میں بھی زندہ ہوں

1993

❖❖❖

اپنی نظر تو ہوگی

جسم کی آنچ تو مدھم ہے بہت ہی مدھم
ذہن کیوں آج بھی اک شعلۂ جوالہ ہے
کیوں تخیل کی ہیں پہنائی میں آفاق اسیر
شمع احساس کی کیوں رشکِ گل و لالہ ہے

❖❖❖

کیوں کسی نور کے گنبد کی سرکتی کرنیں
دل کو انوار کا آئینہ بنا دیتی ہیں
کیوں لبِ جو پہ یہ سبزے کی مچلتی بانہیں
راحتِ روح کے پیمانے سجا دیتی ہیں

❖❖❖

شعر حافظ کا ہو، غالب کا ہو، اقبال کا ہو
وقت کی گرد میں کرتا ہے اجالا کیسے
روز ٹھوکر میں وہ آئے ہوئے بے رنگ خزف
نظر آتے ہیں مجھے لولوئے لالا کیسے

❖❖❖

نگا پر بت کی قبا جب بھی ہووا میرے لیے
کیوں نظر روح بنے، روح فضا ہو جائے
دیوداروں کی ہوا سے وہ سنہری سازش
کیوں میرے واسطے دھرتی کی دعا ہو جائے

❖❖❖

آدمی جسم ہے یا ذہن ہے، آخر کیا ہے
جسم مر جائے مگر ذہن کہاں مرتا ہے
فکر کی موج کبھی شعر کا جادو بن کر
وقت کے کتنے دریچوں سے سفر کرتا ہے

❖❖❖

ہم رہیں یا نہ رہیں اپنی نظر تو ہوگی
اپنے خوابوں کی کبھی کوئی سحر تو ہوگی
راہ رو ہو کہ نہ ہو راہ گزر تو ہوگی

❖❖❖

نغمہ امجد کا ہو گجرال کے دلدوز نقوش
میکدہ تاج کا یا نورجہاں کا جادو
کس طرح حلقۂ امروز کشادہ کر کے
تشنگی کو مری بخشے ابدیت کے سبو

❖❖❖

وقت کے باب میں ہاکنس * کی تازہ تحریر
آگہی کے ورقِ سادہ میں کیا رنگ بھرے
لفظ کیوں میرے لیے لائے وہ شعلہ وہ شراب
جو کبھی مست کرے اور کبھی ہشیار کرے

❖❖❖

بات کیا ہے کہ کسی شوخ کے شاداب خطوط
روح کو پھر سے جوانی کی مہک دیتے ہیں
کیوں یہ محرابیں، یہ گنبد یہ مچلتے ہوئے خم
میرے احساس کو پھولوں کی مہک دیتے ہیں

❖❖❖

میرے بچوں کے تبسم میں یہ کیا ہوتا ہے
مجھ سے ملتے ہیں گلے آکے زمانے کتنے
اس افق پر جو دھنک ہے وہ مرے رنگ کی ہے
وہ کرن کہتی ہے میرے ہی فسانے کتنے

❖❖❖

* (Stephen Hawkins) کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر طبعیات۔

قطعہ —— آنند نرائن ملا

کیا بیان ہوں صفات ملا کی ‏ ‏ ‏ جس پہ پیار آئے وہ برہمن ہے
جس کی کرنوں سے جلوۂ صد رنگ ‏ ‏ ‏ آج اردو ادب کا دامن ہے
نثر میں اک جہان دیدہ وری ‏ ‏ ‏ نظم میں موج فکر روشن ہے
رند جس سے ہے میکدے کو شرف ‏ ‏ ‏ پھول جو آبروئے گلشن ہے
اپنی تہذیب کا منارۂ نور ‏ ‏ ‏ روح انسانیت کا درپن ہے
سوز میں ہر سخن کی آنچ کھلی ‏ ‏ ‏ ساز میں سب کے دل کی دھڑکن ہے
ظلمتوں کی ہزار ہو یلغار ‏ ‏ ‏ پھر بھی اپنا چراغ روشن ہے

2 اکتوبر 1991

❖❖❖

اپنے علی گڑھ کی یاد میں

آئے جب ماجد[1] تو یادوں کا دریچہ کھل گیا
کیسے کیسے ہم صفیران چمن یاد آگئے

کیا نشاط زیست تھا، کیا کیف، کیا جوش جنوں
کتنے منظر انجمن در انجمن یاد آگئے

دل میں پھر افسانہ وافسوں کی شمعیں جل اٹھیں
پھر وہ رنگارنگ خوابوں کے چمن یاد آگئے

فکر کے کتنے کرشمے، فن کے کتنے معجزے
اور وہ کتنے مست صہبائے سخن یاد آگئے

وہ مجاہد، وہ مجاور، وہ موذن، وہ خطیب
ان کے روز وشب کے سارے بانکپن یاد آگئے

وہ نمائش کے مزے، وہ یونین کے معرکے
وہ کلب کے نکتہ کہن یاد آگئے

ریت میں کیا پھول تھے اور گرد میں کیا کیا گلاب
اپنے گلشن کے سبھی سروسمن یاد آگئے

---

1 علی گڑھ کے اولڈ بوائے: یہ یہاں شعبہ انگریزی میں لکچرار تھے۔ بعد میں انڈین فائنس میں آگئے۔ تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے۔ رٹائر ہونے کے بعد لندن میں مقیم ہوئے۔ اور بی۔سی۔سی۔آئی کے مالی مشیر رہے اور وہیں انتقال ہوا۔(30 جنوری1990)

وہ سنہرے خواب جن سے تھی عبارت زندگی
صف بہ صف لے لے کے اپنی انجمن یاد آ گئے
دوستی تھی، دشمنی تھی پیار تھا جھگڑے بھی تھے
دشمنی کے، دوست داروں کے چلن یاد آ گئے
ذہن میں پھر جاگ اٹھا خونِ جگر کا کاروبار
کچھ حنا بدست، کچھ گل پیرہن یاد آ گئے
خواب شیریں ساتھ تھا لیکن نہ نکلی جوئے شیر
اپنے صحرا کے کچھ ایسے کوہکن یاد آ گئے
وہ گلوں کے دامنوں میں خار پھر چبھنے لگے
بلبلوں کے ساتھ وہ زاغ و زغن یاد آ گئے
خوش دلی تھی، وضع داری تھی خوش اوقاتی بھی تھی
اپنی محفل کے وہ شیخ و برہمن یاد آ گئے
شکریہ اے دوست مدھم ہو چکی تھی جنکی لو
وہ چراغ وادیٔ گنگ و جمن یاد آ گئے

❖❖❖

ڈاکٹر عبدالسلام کی نذر[1]

(ان کو نوبل پرائز ملنے کے بعد علی گڑھ آنے پر)

ہمارے دور میں مغرب کے علم و دانش سے
بشر کو نور ملا زیست کو شعور ملا
ہمارے دور میں مشرق کے مئے فروشوں کو
ملا تو بادۂ دو شینہ کا سرور ملا
کسی کی فکر نے فطرت کے راز فاش کیئے
کسی کو ماضیِ گم گشتہ پر غرور ملا
سلام تجھ پہ، ترے ذوق آگہی کے طفیل
دیار شرق کا دیدہ وری میں نام ہوا
وہ کم طلب جو گریزاں تھا بزم عرفاں سے
تری کشش سے بالآخر شریک جام ہوا
عمیق بحر کی موجوں سے کر کے سرگوشی
فضا میں ہر نئے سورج سے ہم کلام ہوا
یہ جستجو یہ متاع نظر ہی سب کچھ ہے
یہ تازہ کارئ زخم جگر ہی سب کچھ ہے
سوال ہوتے رہے تو جواب بھی ہوں گے
یہ سوز و ساز یہ سعئ بشر ہی سب کچھ ہے

1 ان کو نوبل پرائز ملنے کے بعد علی گڑھ آنے پر
ڈاکٹر عبدالسلام نوبل لارئیٹ اور عالمی شہرت کے ریاضی داں 1989

ہمیں سکھایا گیا تھا

(۱)

ہمیں سکھایا گیا تھا
ہیں چند معیار زندگی کے
یہ زخم آداب عاشقی کے
وہ داغ خوابوں کی چاکری کے
نئے حقائق سے دوستی کے

(۲)

ہمیں بتایا گیا تھا
عظیم ہے چاہنے کی خواری
ہر ایک جلوے کی پاسداری
کرن کوئی ہو تو دل پکارے
ہم اس کے ہیں اور یہ ہمارے

(۳)

ہمیں سکھایا گیا تھا
کہ دشت میں بے تکان گھومیں

بہار کی ہر ادا پہ جھومیں
کلی اگر کوئی مسکرائے
تو اس کو دیوانہ وار چومیں

(۴)

وہ سارے دفتر الٹ گئے ہیں
کہاں کے جلوے، کہاں کے نغمے
اداس نظریں اداس چہرے
نہ وہ جنوں کی شراب باقی
نہ آگہی کا حساب باقی
گھڑی میں جینا، گھڑی میں مرنا
کسی طرح صبح و شام کرنا
سبو جو خالی پڑا ہوا ہے
اسی سے ہر لحظہ جام بھرنا

1987

❖❖❖

لمحے کے اسیر

کولرج کا بوڑھا ملاح ایک آفاقی علامت ہے
ہم سب جو آفتاب لب نام ہیں
بوڑھے ملاح کی طرح کسی شادی کے
مہمان کا ہاتھ پکڑ کر
اسے اپنی داستان سناتے ہیں
گاندھی جی اور مولانا آزاد
اور جواہر لال نہرو کی باتیں
حسرت، اصغر اور فانی کے قصے
عبدالحق، ذاکر حسین، ڈاکٹر ضیاء الدین
علی گڑھ جامعہ اور اقبال کی داستان
مگر انھیں ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں
ان کے اپنے لیڈر اور اپنے ہیرو ہیں
انھیں نہ مذہب کے مسائل ستاتے ہیں
نہ ادب کے سوالات نہ سیاست کے عقدے
یہ تو اس کارزار حیات میں ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے ہیں
یہ لمحے کے اسیر
وقت کا عرفان کہاں سے لائیں

مئی 1978

❖❖❖

دانشوری کا زوال

سرِ طوفاں، ساحلوں کی آبرو بنتے گئے
جو کبھی تلوار تھے طوقِ گلو بنتے گئے

ہائے وہ شعلے جو جگنو ہیں کس برسات کے
اف وہ دریا جو سمٹ کر آب جو بنتے گئے

تازہ کاری کے پیمبر، لالہ کاری کے رسول
خانہ باغوں میں طلسمِ رنگ و بو بنتے گئے

آہوانِ دشت کو دیتے تھے جو درسِ خرام
وہ بھی شاہی اصطبل کی آبرو بنتے گئے

فن حکومت کا سہارا، فکر دولت کی کنیز
جو تھے نشتر، سوزنِ تارِ رفو بنتے گئے

چاکِ تقدیرِ بشر سینے کا دعویٰ تھا جنہیں
ایک بوسیدہ قبا کے تار و پو بنتے گئے

جب خس و خاشاک کی بیداد حد سے بڑھ گئی
گرچہ شبنم تھے مگر ہم شعلہ خو بنتے گئے

1973

❖❖❖

نئے سال کی آمد پر

ذرہ ذرہ شیشۂ ساعت سے کم ہوتی ہے ریت
قطرہ قطرہ جذب ہوتا ہے بیاباں میں لہو
ریت کم ہو پھر بھی ہے اس پر کرم خورشید کا
قطرہ کھو جائے مگر بجھتی تو ہے صحرا کی پیاس
الاماں سعیِ مسلسل، آفریں وضعِ جنوں
ہر حقیقت سے سہانا، اس کے خوابوں کا فسوں

❖❖❖

وقت کے دریا میں موجوں کا نہیں کوئی شمار
کوئی نغمہ، کوئی نالہ، کوئی طوفاں، کوئی آگ
سب فنا انجام لیکن کچھ بقا آموز بھی
سب سکوں کی جستجو میں کچھ مگر محشر بدوش
دیکھنا یہ ہے کہ ہے کس موج سے دریا کی لاج
کس کی شورش سے نگوں سر ہوگیا ساحل کا تاج

❖❖❖

کوئی شعلہ جب وفور شوق میں کرتا ہے رقص
اس کا جو ہر آزماتے ہیں خس و خاشاک بھی
آندھیاں آتی ہیں اکثر پرسش احوال کو
تیر بارش کے کیا کرتے ہیں اکثر چھیڑ چھاڑ
پھر بھی یہ شعلہ چراغ محفلِ ہستی تو ہے
بے دلی کے گھر میں، آئینۂ ہستی تو ہے

❖❖❖

1941

میرا مسافر

جب مسافر کسی وادی میں قدم رکھتا ہے
ذہن میں منزل مقصود کی تصویر لیے
دل میں کچھ کرنے کے ارمان کی شمشیر لیے
اپنے سرمائے پہ چپکے سے نظر ڈالتا ہے
دیکھتا ہے کہ کسی نے اسے دیکھا تو نہیں
ساتھ ہے عزم جواں، طبع رواں، ذوق تپاں
کتنے خوابوں کا نشہ کتنے خیالوں کی ترنگ
خس وخاشاک سے دب دب کے ابھرنے کی امنگ
اور پھر راہ پہ یوں دوڑتے ہیں اس کے قدم
جیسے پھولوں میں نسیم سحری ہوتی ہے
سینۂ آب پہ کرنوں کی پری پھرتی ہے
ہو مبارک یہ سفر تجھ کو میرے نورنظر
گو ترے پاس بہت کچھ نہیں ایک نور تو ہے
بند دروازے اسی نور سے کھل جائیں گے
کتنے آراستہ مے خانوں سے چھلکے گی شراب
فکر کے کتنے نہاں خانوں سے ابھریں گے گلاب
نور کے جام میں مہتاب سما سکتا ہے
روشنی مشرق و مغرب میں بچھا سکتا ہے

1961

❖❖❖

ذاکر صاحب کی واپسی پر

صد شکر اپنا مرد قلندر پھر آ گیا
صحرا سے تازہ دولت عرفاں لیے ہوئے
آنکھوں میں عزم کوہ کنی کی جلا لیے
باتوں میں لطف صبح بہاراں لیے ہوئے
جذبہ جسے کچل نہ سکا کوئی بھی ستم
شعلہ جو آندھیوں سے بھی مدھم نہ ہو سکا
دیوانگی کے رقص، لہو کی ترنگ میں
انسانیت پہ جس کا یقیں کم نہ ہو سکا
ہر برق تازہ شمع سیہ خانہ بن گئی
دل وقف خود فریبی عالم نہ ہو سکا
سوز نفس کی آنچ بجھائے نہ بجھ سکی
خون جگر کا نقش تھا، مدھم نہ ہو سکا

❖❖❖

محفل پہ آج موت کا سایہ ضرور ہے

تیری جبیں سے نور فشاں زندگی تو ہے

ذہنوں پہ چھا گیا ہے اندھیرا تو کیا ہوا

ہمدم تری نظر میں ابھی روشنی تو ہے

مرشد کی واپسی پہ یہ حاضر ہیں چند شعر

بے رنگ و بو ہیں پھول مگر تازگی تو ہے۔

(مطبوعہ ''نئی روشنی'' جامعہ نگر 1949)

یورپ سے اپنی آنکھ کا آپریشن کرانے کے بعد واپسی پر یہ نظم لکھی گئی اور سب سے پہلے ہفتہ وار اخبار نئی روشنی دہلی میں شائع ہوئی۔

غزلیں

غزل

کسی جنوں کے پھر آثار دل میں ملتے ہیں
خبر نہ تھی کہ خزاں میں بھی پھول کھلتے ہیں

ہیں فاصلے بھی ضروری محبتوں کے لیے
کہ قربتوں کے سرے نفرتوں سے ملتے ہیں

دلوں میں نور بھی جاگے تو کوئی بات بنے
ہماری بات پہ یاروں کے لب تو ہلتے ہیں

ہجوم میں تو سبھی پر نقاب ہوتا ہے
ہم اصلیت سے فقط تخلیے میں ملتے ہیں

اسی دیار میں بے درد توڑتے ہیں ستم
اسی دیار مین درد آشنا بھی ملتے ہیں

اسی دیار میں کرنوں کا قتل ہوتا ہے
اسی دیار میں رہ رہ کے پھول کھلتے ہیں

❖❖❖

غزل

مری مصروفیت کیا مشغلے کیا
سفر کیا اور سفر کے مرحلے کیا

حقائق جان لیوا ہوگئے ہیں
کہاں کے خواب شیریں ولولے کیا

گداز قلب کیسا بے حسوں میں
جو پتھر ہے وہ اشکوں میں ڈھلے کیا

کجا دریا کجا دریا کا افسوں
سرابوں میں مری کشتی چلے کیا

گزر جائے گی سر سے موج خوں بھی
دعاؤں سے یہ ہنگامہ ٹلے کیا

ہمالہ کی پرانی برف ہے یہ
مری آہوں کی گرمی سے گلے کیا

زمانہ ہے کہ کروٹ لے رہا ہے
سرور اک آپ ہی کے مسئلے کیا

❖❖❖

غزل

یہ سوادِ شام کا ہے کرم کہ مزاج کی ہی نہاد ہے
جو کیا تھا اس کو بھلا دیا جو نہ کر سکے وہی یاد ہے

جسے تھی بہار کی آرزو جسے صبح نو کی تھی جستجو
وہ شہید فصل بہار ہے وہ قتیل باد مراد ہے

نہ وہ ہم رہے نہ وہ تو رہا یہی انقلاب زمانہ ہے
جو دل و جگر کا قرار تھی تری وہ ادا ابھی یاد ہے

دل ناصبور کا کیا کروں اسے کس طرح سے مناؤں میں
کبھی سوگوار بہار میں تو کبھی خزاں میں بھی شاد ہے

کبھی دھوپ ہے کبھی چھاؤں ہے کبھی اشک میں کبھی زمزمے
یہ جو شاعری کا تضاد ہے اسی زندگی کا تضاد ہے

یہ ہزاروں سال کا جانور جو سوار ذہن بشر پہ ہے
اسے کس طرح کریں زیر ہم یہی آجکل کا جہاد ہے

❖❖❖

غزل

خرد کی گرچہ رہی ہیں عنایتیں بھی بہت
جنوں کی ہم سے چلی ہیں روایتیں بھی بہت
طویل راتوں میں یادوں کی شمع جلتی ہے
ہے داستان بھی لمبی حکایتیں بھی بہت
مزاج حضرت انساں ہوا درست کہاں
اگر چہ عرش سے اتری ہیں آیتیں بھی بہت
یہ لوگ ہم سے بغاوت کی بات کرتے ہیں
چلی ہیں ہم سے جنوں کی حکائتیں بھی بہت
سرور ایک خلش تھی جو عمر بھر نہ گئی
اسی خلش نے تراشیں حکایتیں بھی بہت

مارچ1997

❖❖❖

غزل

دشت کو گلزار کرنے کی خلش جاتی رہی
بزم کو بازار کے آداب سکھلاتے ہیں لوگ

حسن کے جوان گنت جلوے ہیں ان کو دیکھئے
اک بدن کے پیچ وخم پر ہی مٹے جاتے ہیں لوگ

گاؤں کی دلدار پگڈنڈی انھیں بھاتی نہیں
شہر کی خونخوار سڑکوں پر بچھے جاتے ہیں لوگ

وہ نہ باغوں کی مہک ہے اور نہ کھیتوں کی بہار
کارخانے کے دھوئیں کے زخم سہلاتے ہیں لوگ

1997

❖❖❖

غزل

وہ نہ آئیں بھی تو اتنا کرلیا کرتے ہیں ہم
ان کی یادوں سے اجالا کرلیا کرتے ہیں ہم

شکریہ ان کا ادا کرتے اک اک زخم پر
یوں بھی گویا ان سے شکوہ کرلیا کرتے ہیں ہم

روپ کی، رنگوں کی، خوشبو کی جو کر لیتے ہیں بات
یوں بھی اظہار تمنا کرلیا کرتے ہیں ہم

اپنے ہر مصرعے میں معنی کی شعاعیں دیکھئے
لفظ کو گرما کے ہیرا کرلیا کرتے ہیں ہم

جن اصولوں سے ملی تھی سرفرازی دہر میں
ان اصولوں کا بھی سودا کرلیا کرتے ہیں ہم

خوف مستقبل کا ہے اور حال سے حیران ہیں
اب تو ماضی کا بھی چرچا کرلیا کرتے ہین ہم

اپنی وحشت نے کیے آباد صحرا بھی کبھی
اب تو آبادی کو صحرا کرلیا کرتے ہیں ہم

جب خس وخاشاک کی بہزاد بڑھتی ہے سرور
ہر نفس کو اپنے شعلہ کرلیا کرتے ہیں ہم

1993

❖❖❖

غزل

وقت کی بات ہے یا شومی قسمت یارو / دیوزادوں پہ ہے بونوں کی حکومت یارو

ہر حقیقت مین بڑے پیچ ہوا کرتے ہیں / تم لیے پھرتے ہو اک سادہ حقیقت یارو

لوگ لمحے کی مسرت کے لیے جیتے ہیں / کیا ہوئی وقت کے عرفاں کی بصیرت یارو

سر ہے قدموں پہ کبھی، ہاتھ کبھی دامن پر / اب عبادت اسے کہیے کہ شرارت یارو

خواب دیکھو تو سہی، خواب دکھاؤ تو سہی / خواب بن جاتے ہیں ایک روز حقیقت یارو

شعلے افسردہ جو ہو جاتے ہیں تو ہوتا ہے یہی / خس و خاشاک کی کھل جاتی ہے قسمت یارو

دل پہ جو برف جمی ہے وہ پگھلتی ہی نہیں / چھیڑو اس خسرو و خوباں کی حکایت یارو

ہر روایت سے بغاوت بھی ضروری ہی تو ہے / کہ بغاوت ہے نئی ایک روایت یارو

صرف لینا جنہیں آتا ہے ہوس کے ہیں غلام / اور دینے کا ہے اک نام محبت یارو

شخصیت کا جو کھرا پن ہے اسے پہچانو / کھوکھلی ہوتی ہے ہر عزت و شہرت یارو

1993

غزل

جنوں کم، جستجو کم، آرزو کم
رگوں میں ہو گیا ہے کیا لہو کم

نگاہیں داستاں کہنے لگی ہیں
ہوا کرتی ہے ان سے گفتگو کم

سبھی کی کھوج میں رہتے ہیں ہم لوگ
مگر رہتی ہے اپنی جستجو کم

نسیم صبح بھی کیا گل کھلائے
اگر کلیوں میں ہو ذوق نمو کم

یہ مانا شہر میں چرچے ہیں ان کے
مگر دشت وفا میں آبرو کم

سرافرازی ملی دنیا میں کیا کیا
مگر اپنے سے ہیں ہم سرخرو کم

نگاہ لطف ساقی کو ہوا کیا
کہ اب مستوں کی ہے کچھ ہاے و ہو کم

بہت بے وقت ہے آدم کی تکرار
ہوا ہے امتیازِ ما و تو کم

جولائی 1993

❖❖❖

غزل

جیو کہ زیست کی مہلت بہت زیادہ نہیں
خبر بھی ہے کہ سحر تک یہ دور بادہ نہیں

بھٹکتے پھرتے ہیں ہم زندگی کے صحرا میں
کہاں کی منزل مقصود، کوئی جادہ نہیں

وہ کس ادا سے یہ کہتے ہیں کیا کہا جائے
کہ ہم نے قتل کیا بھی تو بالارادہ نہیں

غزل تمہارے لیے مرثیہ زمانے کا
کتاب زیست کا کوئی ورق بھی سادہ نہیں

خلش یہی ہے کہ کل کس طرح سے گزرے گا
خدا کا شکر کہ ماضی کا غم زیادہ نہیں

بھڑک اٹھے تو جلا دیں گے گردوپیش کو ہم
ہمارے خون میں بارود ہے، برادہ نہیں

سرور ان سے وفا کی امید رکھتے ہیں
خدا گواہ کہ ان سا بھی کوئی سادہ نہیں

24-7-1993

❖❖❖

غزل

لفظوں کی رو میں سیل معانی بھی دیکھیے
ہر خوش غلاف تیغ کا بانی بھی دیکھیے

بجھتے ہوئے چراغ کی لو پر لکھی ہوئی
اک بزم شب کی لالہ فشانی بھی دیکھیے

کیا دیکھتے ہیں آپ یہ زارونزار جسم
ناطورۂ سخن کی جوانی بھی دیکھیے

ہے بلبلوں کی دید بہت ہی نظر فریب
دریا کی اپنی دھن میں روانی بھی دیکھیے

یہ درد گو نیا ہے پر ایسا نیا نہیں
تدبیر کوئی اس کی پرانی بھی دیکھیے

انسان کو جنون خرد سے ملا تو کیا
گر ہو سکے تو دل کی کہانی بھی دیکھیے

صحرا کی داستاں کوئی سیدھی سڑک نہیں
گم گشتہ رہروں کی نشانی بھی دیکھیے

گہری حقیقتوں کا ملے گا یہیں سراغ
خوابوں کی منتشر سی کہانی بھی دیکھیے

ویرانۂ حیات کا عرفاں ہے گر عزیز
شمع مزار حضرت فانی بھی دیکھیے

اس تند و تیز لہجے کے شعور نشور میں
مدھم سہی سرور کی بانی بھی دیکھیے

16-03-1993

❖❖❖

غزل

پھر گردش ایام کو الزام دیا جائے
پھر اپنے کو دھوکا سحروشام دیا جائے

آنے میں بھی مجبور تھے جانے پہ بھی مجبور
اس جبر کو اچھا سا کوئی نام دیا جائے

پھر ہار گئے معرکۂ زیست میں یارو
ماحول کو کچھ اور بھی الزام دیا جائے

کہتے تو بہت کچھ تھے مگر ہم نے کیا کیا
کس منہ سے نئی نسل کو الزام دیا جائے

ثابت ہے وہی جرم جو ہم نے کیا تھا
قانون کو بھی کوئی نیا نام دیا جائے

ناکام رہے ہم تو کوئی وجہ تو ہوگی
اچھا ہے کہ قسمت کو ہی الزام دیا جائے

جو کہنہ قباؤں میں رفو کرتے ہیں اب تک
ان کو کوئی اچھا سا نیا نام دیا جائے

جولائی 1992

❖❖❖

غزل

زندگی میں کوئی منطق کارگر ہوتی نہیں
ایسی کچھ راتیں بھی ہیں جن کی سحر ہوتی نہیں

دیکھئے کچھ خواب، ان میں گم نہ ہونا سیکھئے
زندگی میں صرف خوابوں پر گزر ہوتی نہیں

صبر اے دل یہ تو کوئی وصل کا لمحہ نہیں
ہجر کی جو بھی ہے شب وہ مختصر ہوتی نہیں

آدمی لمحوں کا ہو جاتا ہے اس حد تک اسیر
وقت کے عرفان کی اس کو خبر ہوتی نہیں

❖❖❖

غزل

آج کے تلاطم میں تربیت نہیں ملتی
شعبدے تو ملتے ہیں شخصیت نہیں ملتی

حسن ہے تو غازے کا پھول ہیں تو کاغذ کے
جس طرف نکل جاؤ اصلیت نہیں ملتی

علم کے ادارے بھی اب تو کارخانے ہیں
علم کے اداروں میں علمیت نہیں ملتی

بازگشت ماضی کی بازیافت مغرب سے
خوب و زشت کی ان میں معرفت نہیں ملتی

دور میں غلامی کے مردِ حر بھی ہوتے ہیں
آج فرد ہے آزاد حریت نہیں ملتی

شاعری بھی کرتب ہے زندگی بھی کرتب ہے
پینترے بھی ملتے ہیں شعریت نہیں ملتی

اپنی اپنی ڈفلی ہے راگ اپنا اپنا ہے
ٹولیاں تو ملتی ہیں قومیت نہیں ملتی

بہہ رہے ہیں دھارے پر رو رہے ہیں قسمت کو
قسمتیں بدلنے کی اہلیت نہیں ملتی

لوگ اب علی گڑھ میں شعبدے دکھاتے ہیں
نذرِ دید و دل کی خاصیت نہیں ملتی

اپریل1991

❖❖❖

غزل

جو پارسا ہیں کبھی یہ بھی سوچتے ہوں گے
انھیں گناہ کا کچھ حوصلہ بھی مل جائے
یہ پیچ و خم بھی اسی واسطے گوارہ ہیں
کہ پیچ و خم میں کوئی راستا بھی مل جائے
دوا جو اور کسی درد کا بہانہ نہ ہو
ہمارے دور میں ایسی دوا بھی مل جائے
یہ منزلیں تو فقط حوصلے سے ملتی ہیں
جنوں کا عقل سے کچھ سلسلہ بھی مل جائے
امید کم ہے مگر ہم اسی پہ جی لیں گے
کہ اس دیار میں درد آشنا بھی مل جائے
جو آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے
بتوں کی راہ میں ہم کو خدا بھی مل جائے
ہمارے ہاتھ نہ پہونچیں گے ان کے دامن تک
اگر بلندی دستِ دعا بھی مل جائے

اپریل 1991

❖❖❖

غزل

عام اس محفل میں ذوق آگہی کیسے کریں
آشکارا اس پہ رمز زندگی کیسے کریں

اہل دل، اہل دول کی چاکری کیسے کریں
ہم ہیں شاعر، شاعری سے دشمنی کیسے کریں

اک خدا کی بندگی کا حق ادا ہوتا نہیں
شہر کے اتنے بتوں کی بندگی کیسے کریں

بے حسی جب بزم کا معمول ہوجائے تو پھر
سوز و مستی عام کرنے میں کمی کیسے کریں

کیسے دیکھیں حلقہ یاراں میں یہ افلاس ذہن
فکر کی دادو دہش میں ہم کمی کیسے کریں

حسن ہو یا ہو سیاست سب بناتے ہیں غلام
دوستی کے ہم ہیں قائل، چاکری کیسے کریں

ظلمتوں کی اس قدر ہیبت ہے طاری رات پر

اب دیے سہمے ہوئے ہیں چاکری کیسے کریں

اب مشینوں کے دھوئیں، اب بستیوں کی دھند میں

آسماں والے زمیں پر روشنی کیسے کریں

کر دیا پتھر جنہیں سودو زیاں کی فکر نے

ان کے پہلو میں نظر کی گدگدی کیسے کریں

نت نئے زخموں کی دولت جس نے بخشی ہے ہمیں

اس ادائے فتنہ گر سے بے رخی کیسے کریں

حسن سے عشوہ گری، فطرت سے جادو چھن گیا

سوچتے ہیں ہم سرور اب شاعری کیسے کریں

❖❖❖

غزل

جبر کی وہ روش نہیں جاتی
درد کی پرورش نہیں جاتی

دھوپ ڈھلتی ہے شام ہوتی ہے
دل میں ہے جو تپش نہیں جاتی

بھر دئے زندگی نے کتنے زخم
وہ جو تھی اک خلش نہیں جاتی

لوگ کہتے تو ہیں نئے ہیں ہم
وہ پرانی روش نہیں جاتی

روح کی بات میں بھی دیکھا ہے
جسم کی وہ کشش نہیں جاتی

مست کیسے ہو یاد ماضی سے
ذہن کی سرزنش نہیں جاتی

ہار جاتے حقیقتوں سے سرور
خواب کی چپقلش نہیں جاتی

❖❖❖

غزل

ضرور وقت کے تیور کڑے سے لگتے ہیں
تمام لوگ جو سہمے ہوئے سے لگتے ہیں

دلوں کا حال تو کھلتا ہے پاس آنے میں
وگرنہ دور سے سب ہی بھلے سے لگتے ہیں

ہزار شیوہ ادائیں، ہزار رنگ جمال
میں جب بھی ان سے ملوں کچھ نئے سے لگتے ہیں

حجاب کیسے در آیا ہے دلنوازی میں
کہ اب تو قرب میں بھی فاصلے سے لگتے ہیں

لکیریں ساری سیاہ و سفید میں گم ہیں
جو مسئلے ہیں وہ اب دائرے سے لگتے ہیں

یہ آئے دن کے حوادث نے کر دیا بے حال
کہ سانحے بھی اب واقع سے لگتے ہیں

وجود اپنا بکھرتا ہے ان کی بانہوں میں
قریب آ کے وہ جب بھی گلے سے لگتے ہیں

جو فکر و فن کے دکھاتے رہے افق کتنے
تمہارے شہر میں کیوں سرپھرے سے لگتے ہیں

نفس سے ان کے معطر کبھی وجود مرا
کبھی خیال سے بھی وہ پرے سے لگتے ہیں

❖❖❖

غزل

زندگی نغمہ بھی شراب بھی ہے   زندگی قہر بھی عذاب بھی ہے
کون ہیں ہم کہاں سے آئے ہیں   ان سوالوں کا کچھ جواب بھی ہے
گو حقائق نے دکھ دیے کیا کیا   میری آنکھوں میں ایک خواب بھی ہے
انہیں آنکھوں میں شوخیاں رقصاں   انہیں آنکھوں میں اک حجاب بھی ہے
ہم ابھی ان کی بارگاہ میں تھے   کچھ سکوں ہے کچھ اضطراب بھی ہے
اب بھی قدروں کی بات کرتے ہیں   اے سرور آپ کا جواب بھی ہے

❖❖❖

غزل

خوشی تھوڑی سی، غم کا سلسلہ لمبا، قیامت ہے
یہ فطرت کی غلط بخشی کا نظارہ قیامت ہے
بڑی مدت میں تہذیب بشر، یاں تک تو پہونچی تھی
مگر پھر آدمی کا جانور بننا قیامت ہے
نئے انسان کو ماضی کی جانب لوٹ جانا ہے
ہمارے مہربانوں کا یہ منصوبہ قیامت ہے
ستم گر کے رخِ انور پہ غازہ ہے تبسم کا
ستم گر کے فسوں کا یہ نیا چہرہ قیامت ہے
سرور اب بھی سیاہی سے کرن کی بات کہتے ہو
تمھاری سادہ لوحی کا یہ نظارہ قیامت ہے

اپریل 1991

❖❖❖

غزل

کیا کیجئے جو ساتھ سبھی چھوڑنے لگیں
جو ہاتھ پاؤں تھے وہی منھ موڑنے لگیں

کوئی نہ کوئی بال تو رہ جائے گا ضرور
ٹوٹے ہوئے دلوں کو اگر جوڑنے لگیں

پتھر دلوں سے کوئی امید وفا فضول
بہتر تو ہے کہ اپنا ہی سر پھوڑنے لگیں

❖❖❖

غزل

یہیں کہیں کبھی ہوتی تو تھی اصول کی بات	وہ ہے عوام کی بولی میں اب فضول کی بات
اتار لائے ہیں ہم چاند اپنی دھرتی پر	سنو تو ہم سے سنو شعر کے نزول کی بات
سفر کا علم، نہ راہوں کے پیچ و خم کی خبر	بہت ہے منزل مقصود کے حصول کی بات
شریک میکدہ سب ہوں، شریک جام ہوں چند	ہمارے دور میں ایسی ہی ہے بشمول کی بات
دھنک سے ان کی ہمارا چمن، چمن ٹھہرا	الگ الگ سہی کہنے کو پھول پھول کی بات

ہوا ہو جو کبھی اپنی ہی تیغ سے زخمی
سرور ہم سے وہ آ کر کرے اصول کی بات

جولائی 1991

نوٹ:۔ فضول کی بات عوام میں مستعمل ہے۔ یہاں اسی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

غزل — نذر میر

دن ڈھلا شام ہوئی سایوں کا لشکر نکلا
ساری کرنوں کا یہی ایک مقدر نکلا

فکر فن پھولتے پھلتے ہیں تو تنہائی میں
کھو گیا بھیڑ میں وہ گھر سے جو باہر نکلا

زندگی ایک توازن کی طلب گار رہی
خیر بھی حد سے سوا ہو کے نرا شر نکلا

رائگاں لاکھ سہی پھر بھی شہیدوں کا لہو
آپ کے رنگ حنا کے تو برابر نکلا

اب تو وحشت میں ہی دیوانوں کا ملتا ہے سکوں
جس بیاباں سے وہ گزرا وہی اب گھر نکلا

وہ سیاست کا فسوں ہو کہ صحافت کا طلسم
گرمیٔ خون جگر کے نہ برابر نکلا

میر یاد آئے جو گلشن کی خرابی دیکھی
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

کچھ تھی خوابوں کی خلش کچھ تھا حقائق کا عذاب
یوں حساب اپنے گناہوں کا برابر نکلا

اگست 1991

❖❖❖

غزل

محبت میں بھی رنجش کے مقام آتے ہی رہتے ہیں　　اندھیرے اور اجالے صبح شام آتے ہی رہتے ہیں
صفیں سونی ہیں وہ اللہ والے کھو گئے کب کے　　ہدایت کے لیے لیکن امام آتے ہی رہتے ہیں
ابھی آزاد مردوں کے لیے ہے تنگ یہ دنیا　　کوئی بن جائے آقا پھر غلام آتے ہی رہتے ہیں
مزا آتا ہے کچھ ان کو ستانے میں منانے میں　　پیام آتے ہی رہتے سلام آتے ہی رہتے ہیں
وہی خواری وہی بے دست و پائی ان کی قسمت ہے　　دکھاوے کو مسیحائے عوام آتے ہی رہتے ہیں
لہو سے اپنے یوں ہوتی ہے صحرا کی چمن بندی　　گلوں کے ساتھ خاروں کے بھی کام آتے ہی رہتے ہیں
نظر والوں کی پرسش اس سیہ خانے میں کیا ہوگی　　مگر تاریخ میں تو ان کے نام آتے ہی رہتے ہیں
جھلک اکثر نئے تارے دکھاتے ہی نہیں اپنی　　کہیں دو ایک سورج زیر بام آتے ہی رہتے ہیں

ستمبر 1991

❖ ❖ ❖

غزل

امیدیں کتنی تھیں مایوسیاں بھی کتنی ہیں　　ہمارے دور کی نیرنگیاں بھی کتنی ہیں
اکیلا کیسے لڑے صف بصف اندھیروں سے　　نہتا چاند ہے اور بدلیاں بھی کتنی ہیں
نہ گھر میں چین نہ باہر سکوں میسر ہے　　ہمارے شہر کی مجبوریاں بھی کتنی ہیں
زباں پہ پیار کے بول اور وسوسے دل میں　　ہیں ساتھ ساتھ مگر دوریاں بھی کتنی ہیں
انھیں یقین کا سورج نگل سکے گا کبھی　　گماں کے خوف کی پرچھائیاں بھی کتنی ہیں
بدن پہ زخم ہیں کتنے تو روح میں کتنے　　ترے شہیدوں کی رنگینیاں بھی کتنی ہیں
خزاں کو جانو بہار اور سراب کو دریا　　دل غریب کی مجبوریاں بھی کتنی ہیں
سروں سے اونچی ہے مہنگائی خون سستا ہے　　گرانیاں تو ہیں، ارزانیاں بھی کتنی ہیں
وہ پوچھتے ہیں کہ کیوں تم بجھے سے رہتے ہو　　بتانِ شوخ کی دلداریاں بھی کتنی ہیں
دھرا ہی کیا ہے دھنک میں جو اس طرف دیکھیں　　کہ زعفران کی دلداریاں بھی کتنی ہیں
ہجوم ہو، کوئی جلسہ ہو، جشن ہو کوئی　　بھرے وجود میں تنہائیاں بھی کتنی ہیں
سحر سے اب بھی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں　　سرور آپ کی نادانیاں بھی کتنی ہیں

1991

❖❖❖

غزل

تمہیں جو فن کا ہمالہ دکھائی دیتا ہے
مجھے تو صرف کرشمہ دکھائی دیتا ہے
خبر بھی ہے کہ اندھیرے نے روپ بدلا ہے
فضا میں گرچہ اجالا دکھائی دیتا ہے
یہ کیا غضب ہے سمندر بدوش ہے پھر بھی
بشر ازل سے ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے
سرور زیست کو کچھ دے سکو تو کیا کہنا
قریب موت کا سایا دکھائی دیتا ہے

1991

❖❖❖

غزل

مذہب کی بات علاقے کی بات اور زباں کی بات
سب کچھ تو ہے مگر نہیں ہندوستاں کی بات
ہنگامہ گھر میں کیا ہے کسی کو خبر نہیں
ہوتی ہے گرچہ بزم میں سارے جہاں کی بات
اگلا وہ کاروبار جنوں سرد ہو گیا
اس درجہ عام ہوگئی سود و زیاں کی بات
دھرتی پہ نقش اپنے لہو سے بنا تو لیں
چھیڑیں گے پھر ضرور کبھی آسماں کی بات
منزل جو زیست کی ہے وہ مستانہ طے کرو
آتی ہے یاد مجھکو کسی مہرباں کی بات
رخصت ہوئے وہ لوگ وہ تہذیب کھو گئی
اس مرحلے پہ تم نے نکالی کہاں کی بات
ایک ایک خواب قتل حقائق نے کردیا
کیا کہئے ایک معرکۂ بے اماں کی بات
اس سے ہمارے گلشن صد رنگ کا بھرم
اردو زباں کی بات ہے ہندوستاں کی بات
سچ سے فرار شیوۂ یاراں ہے کیوں سرور
یاں چل رہی ہے خوب ہی وہم وگماں کی بات

مارچ 1991

❖❖❖

غزل

میں نے جو راہیں نکالیں شاہراہیں بن گئیں
فکر کی کرنیں دو عالم کی نگاہیں بن گئیں

میں نے بانٹی دولت جذب وجنوں اس شان سے
دھجیاں میری بھی کتنوں کی کلاہیں بن گئیں

آدمی کو یہ ترقی کس قدر مہنگی پڑی
شاہراہیں دن دہاڑے قتل گاہیں بن گئیں

اللہ اللہ زیست کی بے رحم منطق کا فشار
سرخوشی کی جو بھی وجہیں تھی کراہیں بن گئیں

اپنا نغمہ بھی بالآخر ہوگیا نالۂ سرور
وقت کی جو کروٹیں تھی وہ کراہیں بن گئیں

جولائی 1990

❖❖❖

غزل

حرف روشن تھے جو کل اب ہیں فسانے کتنے
ہم نے دیکھے ہیں نئے اور پرانے کتنے

کبھی ماحول کا ماتم کبھی موسم کا ملال
کچھ نہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں بہانے کتنے

صبح جو آتی ہے اک زخم نیا لاتی ہے
درد کے بنتے ہی جاتے ٹھکانے کتنے

ایک ادا، ایک نظر، ایک امنگ ایک ترنگ
اسی سرخی سے نکل آئے فسانے کتنے

آرزو حسرتیں جلتے ہوئے خوابوں کا دھواں
اس خرابے میں بھی ملتے ہیں خزانے کتنے

یاد کا ہے یہ کرشمہ کہ تصور کا طلسم
ایک لمحے میں سمٹ آئے زمانے کتنے

20 اکتوبر 1990

❖❖❖

غزل

جو آئیں میکدے میں کاش انھیں پینا بھی آجائے
جو زندہ ہیں فقط ان کو کبھی جینا بھی آجائے

بشر اب تک تو سیتا ہی رہا ہے چاک فطرت کے
اسے اپنی قبا کے چاک کو سینا بھی آجائے

لرزتے ہاتھ سے ان کے چھلک جاتی ہے مئے اکثر
کبھی ایسا ہو رندوں کو ترے پینا بھی آجائے

دسمبر 1990

❖❖❖

غزل

وہ احتیاط کے موسم بدل گئے کیسے — دیے سے دل کے اندھیرے میں جل گئے کیسے

بنا دیا تھا زمانے نے برف کی مانند — ہم ایک شوخ کرن سے پگھل گئے کیسے

خزاں سے جن کو بچالائے تھے جتن کر کے — وہ نخل اب کے بہاروں میں جل گئے کیسے

جو دور سے نظر آئے تھے کبھی فرشتہ سے — قریب آئے تو چہرہ بدل گئے کیسے

امید جن سے تھی وضع جنوں نبھانے کی — وہ لوگ وقت کے سانچے میں ڈھل گئے کیسے

ستارے جذب ہوئے گرد راہ میں کیا کیا — خیال و خواب کے آئیں بدل گئے کیسے

ہر ایک سایہ دیوار کی لپیٹ میں ہے
سرور آپ ہی بچ کر نکل گئے کیسے

❖❖❖

غزل

شوق کے شعلے کو لفظوں میں پرو سکتا ہے کون　　بحر کی وسعت کو قطرے میں سمو سکتا ہے کون
ان کے دامن کی ہوا نے ہم کو دیوانہ کیا　　ورنہ یوں رسوا سر بازار ہو سکتا ہے کون
اپنے غم کا بوجھ اٹھانا بھی کوئی آساں نہیں　　ساری دنیا کے غموں کا بوجھ ڈھو سکتا ہے کون
رات بھر جلسے ہیں، تقریریں ہیں ہنگامے ہیں یاں　　اس قدر جب شور برپا ہو تو سو سکتا ہے کون
ولولہ دل میں نہ ہو تو خواب کیا کام آئیں گے　　جام خالی ہو تو پھر سرشار ہو سکتا ہے کون
سوز و مستی کی کمی پر آپ کیوں حیران ہیں　　خوف کے سائے میں رہ کر مست ہو سکتا ہے کون

❖❖❖

غزل

میری معروفیت کیا مشغلے کیا
سفر کیا اور سفر کے مرحلے کیا

حقائق جان لیوا ہوگئے ہیں
کہاں کے خواب شیریں ولولے کیا

گدازِ قلب کیا ہو بے حسوں میں
جو پتھر ہے وہ اشکوں میں ڈھلے کیا

کجا دریا کجا دریا کا افسوں
سرابوں میں مری کشتی چلے کیا

گزر جائے گی سر سے موج خوں بھی
دعاؤں سے یہ ہنگامہ ٹلے کیا

ہمالہ کی پرانی برف ہے یہ
میری آہوں کی گرمی سے گلے کیا

زمانہ ہے کہ کروٹ لے رہا ہے
سرور اک آپ ہی کے مسئلے کیا

1990

❖❖❖

غزل

سوال کتنے ہیں ملتا نہیں جواب کوئی
وہ الجھنیں ہیں کہ جن کا نہیں حساب کوئی

عذاب خواب کا بھی اور شکست خواب کا بھی
مرے عذاب سے بڑھ کر نہیں عذاب کوئی

وہی مزاج وہی کیفیت وہی رفتار
کہاں سے آئے گا ایسے میں انقلاب کوئی

ستارے کتنے یہاں ڈوبتے ابھرتے ہیں
ہزاروں سال میں بنتا ہے آفتاب کوئی

نظر کا بھی ہے فریب اور خیال کا بھی فریب
کہاں سے آئے گا احساس کا جواب کوئی

اب اس سے بڑھ کے سزا اور کیا ملے گی ہمیں
وہ کہہ رہے ہیں کہ دیکھا کرو نہ خواب کوئی

نہ آرزو کا نشہ ہے نہ جستجو کا مزہ
کب اس مزاج کا دیکھا گیا شباب کوئی

غبار میں بھی کرن ڈھونڈتے رہے ہیں سرور
ہماری سادہ دلی کا بھی ہے جواب کوئی

جون 1990

❖❖❖

غزل

یہ چڑھے ہوئے دریا جانے کب اتر جائیں
آگہی کے دیوانے آگہی سے ڈر جائیں

بے بسی ہماری بھی بے کسی نہ بن جائے
درد سے سنور جائیں رنج سے نکھر جائیں

شہر کی ہوا قاتل گاؤں کی فضا بسمل
کون سی ہے اب منزل کیا کریں کدھر جائیں

خواب بھی حقیقت بھی آرزو بھی حسرت بھی
یہ بھری پری دنیا کس پہ چھوڑ کر جائیں

کچھ سوال ہو ہونٹوں پر کچھ خیال آنکھوں میں
زندگی کی رونق سے اس طرح گزر جائیں

جولائی 1989

❖❖❖

غزل

نہ پانے کا اسے کچھ غم نہیں ہے
کہ اس کو چاہنا ہی کم نہیں ہے

لہو کا رنگ مدھم ہو بھی جائے
نظر کا شعلہ تو مدھم نہیں ہے

مرے کچھ خواب میری زندگی تھے
مگر اب دن میں وہ دم خم نہیں ہے

زمانے سے گلہ ہے مجھ کو بے شک
مگر خود سے گلہ بھی کم نہیں ہے

عجب پتھر دلوں کا شہر ہے یہ
یہاں اک آنکھ بھی پر نم نہیں ہے

اسی سے سارے ہنگامے جہاں کے
فسونِ آرزو بھی کم نہیں ہے

جدھر دیکھو ہیں دیواریں خودی کی
کسی کا یاں کوئی محرم نہیں ہے

لٹایا بے دریغ انساں نے اس کو
مگر فطرت کی دولت کم نہیں ہے

کبھی عالم کی نظروں میں ہمیں تھے
ہمارا اب کوئی عالم نہیں ہے

1989

❖❖❖

غزل

دورِ خرد میں دیوانوں نے تھورا سا یہ کام کیا
دشت وفا میں پھول کھلائے کانٹوں کو گلفام کیا
دھندلی فکر ہے، سستی حکمت، نشہ بہت، مستی کم
کیسا نور بصیرت تم نے اس حلقے میں عام کیا
خوشحالی میں کچھ قدروں کی پامالی تو ہونی تھی
سوچ کے یہ سب، خوشحالی کو دور سے ہم نے سلام کیا
بچ نکلا تھا جو کافر کچھ شوخ اداؤں سے اب تک
اس دل کو اک سادہ نگہ نے جانے کیسے رام کیا
دن نکلا وہ رات گئی وہ وقت گیا وہ بات گئی
تم نے محفل کو ماضی کے سائے کا ہی غلام کیا
کچھ یادوں کے غبار کو دیکھا کچھ محفل کی رونق کو
سچ ہے اردو والوں نے ہی اردو کو بدنام کیا
ہم بھی آخر کب تک سہتے یہ حالات کا جبر سرور
اپنے پاس جو خواب بچے تھے ان کو بھی نیلام کیا

5جولائی 1989

❖❖❖

غزل

یوں تو کہنے کو حقائق کا پرستار رہا
آدمی کتنے فریبوں میں گرفتار رہا

اسکو رکھا گیا پابند سلاسل برسوں
جو نوا سنج فراز رسن و دار رہا

زیست اس کے لیے اک خوف مسلسل ہی رہی
جو اسیر خلش اند کو بسیار رہا

آدمی میں کوئی شئے کم تھی تو پھر کیا کرتا
لاکھ آزاد رہا پھر بھی گرفتار رہا

لطف سے اس نے کبھی مجھکو دیا تھا اک جام
عمر بھر ایک اسی جام سے سرشار رہا

زندگی قرض ترا مجھ سے ادا کیا ہوتا
خوف سے نکلا تو خوابوں میں گرفتار رہا

سر پہ گرتی تھی جو دیوار وہ گر کر ہی رہی
کوئی سوتا ہی رہا اور کوئی بیزار رہا

اگست1989

غزل

ذہن کے شانے کی کاوش بے اثر ہوتی گئی
زلفِ ہستی اور بھی پیچیدہ تر ہوتی گئی

جس قدر بڑھتا گیا سود وزیاں کا کاروبار
داستان اپنی بھی اتنی مختصر ہوتی گئی

اہل دانش کے نقابوں کا بھرم کھلتا گیا
اپنی شوریدہ سری ہی معتبر ہوتی گئی

وہ سیاہی کی سفیدی کی لکیریں کھو گئیں
کس قدر مشکل تمیز خیر و شر ہوتی گئی

وہ جو خوابوں سے بچا الجھے حقائق لے گئے
کیا کہیں کتنے عذابوں میں بسر ہوتی گئی

سب سہارے لٹ گئے اپنا سہارا رہ گیا
آخرش بے چارگی ہی چارہ گر ہوتی گئی

زندگی کی وسعتوں کا تجربہ مہنگا پڑا
کائنات اپنی سمٹ کر مختصر ہوتی گئی

1989

❖❖❖

غزل

شب دراز کی مشق ستم کو کیا کہیے　　اور اس پہ صبح کے ابر کرم کو کیا کہیے
ملی ہیں شیخ حرم سے بشارتیں ہر چند　　ادائے گوشۂ چشم صنم کو کیا کہیے
وہ اونچ نیچ رلاتی تھی خون کے آنسو　　برابری کے اب اس بیش و کم کو کیا کہیے
فغاں ہے کوچہ و بازار میں مگر پھر بھی　　سکوت حلقۂ اہل قلم کو کیا کہیے
کہاں ہے روح کی فریاد درد کا عرفاں　　اس عام شیوۂ درد شکم کو کیا کہیے

جو اپنے ساتھ خزاں کی اداسیاں لائے
تو اس بہار کے نقش قدم کو کیا کہیے

1965

❖❖❖

غزل

لذتیں تو کھوئیں کچھ حسرتیں لے کر چلیں
دشت میں آوارہ گردی کر چکے اب گھر چلیں

جانتے ہیں اہل دل رسم زمانہ ہے یہی
پہلے ہو پھولوں کی بارش اور پھر پتھر چلیں

جاتے جاتے میکدے کا کچھ بھرم رکھنا تو ہے
آنے والوں کے لیے دوچار ساغر بھر چلیں

ذات کیا ہے کائناتی وسعتوں کی گرد راہ
قید گھر میں کیوں ہیں گھر سے اک ذرا باہر چلیں

کب تلک اوروں کا منھ دیکھا کریں اس حشر میں
اس بساط سادہ میں کچھ رنگ اپنا بھر چلیں

عمر بھر تو ہم لہو روتے رہے ہیں اے سرور
دشت میں کچھ کاروبار گل کا ساماں کر چلیں

❖❖❖

غزل

آدمی اپنا پجاری ہے یہ سچ ہے کہ نہیں
مورتی میں بھی مداری ہے یہ سچ ہے کہ نہیں

دن تو ویسے ہی کڑی دھوپ میں لگتا تھا پہاڑ
رات کچھ اور بھی بھاری ہے یہ سچ ہے کہ نہیں

علم کی جوت سے بھی دل کا اندھیرا نہ گیا
عقل ہر جنگ میں ہاری ہے یہ سچ ہے کہ نہیں

یہ سفیدی یہ سیاہی کی لکیریں کیسی؟
جھوٹ کی سچ سے بھی یاری ہے یہ سچ ہے کہ نہیں

معرکۂ خواب وحقیقت کا ہو یا عشق کی جیت
جان ہر حال میں پیاری ہے یہ سچ ہے کہ نہیں

ہم نے ہر شیے کو دیا رنگ لہو سے اپنے
زندگی رنگ سے عاری ہے یہ سچ ہے کہ نہیں

ان کی خوشبو کا یہ جادو ہے مرا کچھ بھی نہیں
ہر طرف باد بہاری ہے یہ سچ ہے کہ نہیں

دل زباں کا بھی کہاں ساتھ دیا کرتا ہے
بے ثمر رائے شماری ہے یہ سچ ہے کہ نہیں

کتنے ہنگاموں میں پسپائی مقدر تھی سرور
جنگ ہر حال میں جاری ہے یہ سچ ہے کہ نہیں

❖❖❖

غزل

بس ایک فریب مسلسل ہے زندگی کیا ہے / مگر فریب نہ کھائے تو آدمی کیا ہے
کوئی چراغ جلاؤ کوئی غزل چھیڑو / نہ کوئی نور نہ نغمہ تو زندگی کیا
نگاہ لطف نے دی اس کو جرأت پرواز / وگرنہ اپنے جنوں کی بساط ہی کیا ہے
تمہارے طرۂ زرتار کو خدا رکھے / ہمارے خون جگر کی برابری کیا ہے
میں چند خوابوں کا قیدی، تم اپنی ذات میں قید / بلائے جاں ہے، اسیروں کی زندگی کیا ہے
ہے بے حساب ترقی ہو یا تنزل ہو / کہیں تو کیسے کہیں، بیسویں صدی کیا ہے
بدن کی بات بھی آجائے گی کہیں نہ کہیں / نہ ہو جو روح کا نغمہ تو شاعری کیا ہے
یہ کیا غضب ہے چکاچوند ہوگئیں آنکھیں / دلوں میں نور نہ دوڑے تو روشنی کیا ہے
کہیں ہے جنس کا جبر اور کہیں ہے جسم کی جوت / زمانہ بھول گیا وضع عاشقی کیا ہے
ہر ایک حال میں ان کی خوشی کا پاس رہا / کبھی تو ہم سے بھی پوچھیں تری خوشی کیا ہے
یہاں سبھی خس و خاشاک سے ہوئے خاموش / بتائے کون کہ شعلوں کی زندگی کیا ہے
یہ چند خواب، یہ پیہم خلش، یہ عکس نگار / سرور اپنے خرابے میں بھی خوشی کیا ہے

1986

غزل

شہروں میں بہت حسن ہے جادو تو نہیں ہے
فطرت کا مگر وہ خم ابرو تو نہیں ہے

ملتے ہیں بہت شوخ نگاہوں کے یہاں تیر
پر دل میں کوئی تیر ترازو تو نہیں ہے

لفظوں کے طلسمات بڑے ہوش ربا ہیں
ان میں میری تہذیب کی خوشبو تو نہیں ہے

کیوں ہم پہ ہے یہ لطف وعنایات کی بارش
ان میں بھی ستم کا کوئی پہلو تو نہیں ہے

انسان کے قابو میں فلک بھی ہے فضا بھی
اپنے پہ اسے آج بھی قابو تو نہیں ہے

خوشبو کوئی شاداب کئے ہے دل و جاں کو
پھیلا ہوا وہ حلقۂ گیسو تو نہیں ہے

تم اپنے گریباں میں ذرا جھانک کے دیکھو
مانا کہ حسینوں میں وہ خوبو تو نہیں ہے

ہے جشنِ ترقی میں بھی غم اپنی زباں کا
دیکھو یہ کوئی عاشقِ اردو تو نہیں ہے

1986

غزل

شاعری کو زندگی سے کچھ الگ پاتے ہیں لوگ   زندگی کی شاعری کو بھولتے جاتے ہیں لوگ

پانیوں میں کون اترے، موتیوں کے واسطے   اب تو ساحل سے ہی خالی سیپیاں لاتے ہیں لوگ

بوجھ ان کا کیوں اٹھائے کارزارِ زیست میں   خواب سارے اپنے بستر پر ہی چھوڑ آتے ہیں لوگ

کون اپنے بت تراشے، کون یہ زحمت کرے   دوسروں کے ہی گھروں سے بت چرالاتے ہیں لوگ

اب لبھاتے ہی نہیں پھولوں کے یہ ٹھہرے نقوش   ہر نئی تتلی کے رنگوں پر بچھے جاتے ہیں لوگ

جو ملی چلتی ہوئی گاڑی اسی پر چڑھ گئے   کیا ستم ہے پھر بھی دانشور کہے جاتے ہیں لوگ

کچھ بھی ہو لیکن معانی کی کرن دیکھی نہ جائے .   خوشنما لفظوں کی کیسی دھند پھیلاتے ہیں لوگ

1986

❖❖❖

غزل

سفر میں زیست کے دیکھے ہیں ہم نے خواب بہت — اگر چہ خوابوں سے ہم کو ملے عذاب بہت
نہ جن کے ذہن میں شعلہ نہ قلب میں کوئی آنچ — انہیں کو لوگ سمجھتے ہیں کامیاب بہت
نہ جانے میری نگاہوں نے کیا کہا ہوگا — ہے آج ان کے ہر انداز میں حجاب بہت
نہ ان میں اگلی سی خوشبو نہ ان میں اگلا سا رنگ — اگر چہ آج بھی کھلتے تو ہیں گلاب بہت
ہمارے دور میں تھوڑی سی پی کے مست تھے لوگ — تمہارے دور میں کم ہے نشہ شراب بہت
تم اپنے چھوٹے سے تارے پہ یوں نہ اتراؤ — فضا میں بنتے بگڑتے ہیں آفتاب بہت
وہی زمیں ہے، وہی آسماں، وہی آدم — اگر چہ دہر میں آئے ہیں انقلاب بہت
نہ کوئی خواب جلیل، نہ کوئی نقش جمیل — اگر چہ درس میں بدلے گئے نصاب بہت
خطا تو اس کی سہی، پر عطا رہی کسی کی — بھری بہار میں انساں ہوا خراب بہت
کہاں سے آئے ہیں ہم اور جا رہے ہیں کہاں — سوال ایک تھا لیکن ملے جواب بہت
حضور اہل نظر آبرو گئی ان کی — اگر چہ اہل دول سے ملے خطاب بہت
نکالے برف سے شعلے، کھلائے ریت میں پھول — سرور اپنے گناہوں کا ہے حساب بہت

1985

❖❖❖

غزل

کسی جنوں کے پھر آثار دل میں ملتے ہیں
خبر نہ تھی کہ خزاں میں بھی پھول کھلتے ہیں

ہیں فاصلے بھی ضروری محبتوں کے لیے
کہ قربتوں کے سرے نفرتوں سے ملتے ہیں

دلوں میں نور بھی جاگے تو کوئی بات بنے
ہماری بات پہ یاروں کے لب تو ہلتے ہیں

ہجوم میں تو سبھی پر نقاب ہوتا ہے
ہم اصلیت سے فقط تخلیے میں ملتے ہیں

اسی دیار میں بے درد توڑتے ہیں ستم
اسی دیار میں درد آشنا بھی ملتے ہیں

اسی دیار میں کرنوں کا قتل ہوتا ہے
اسی دیار میں رہ رہ کے پھول کھلتے ہیں

❖❖❖

غزل

جس کو دیکھو وہی لمحے کی مسرت مانگے
دل دیوانہ تو تھوڑی سی بصیرت مانگے

حسن کی کوئی ادا عشق کا کوئی اعجاز
دل جو مانگے تو یہی حرف و حکایت مانگے

فن جو آئینہ دکھاتا ہی رہا فطرت کو
وہی فطرت کو بدلنے کی جسارت مانگے

اب کہاں ہے وہ کڑی دھوپ میں تیشے کا جلال
ہر کوئی سایۂ دیوار کی راحت مانگے

یہ تجارت کا، سیاست کا، صناعت کا ہے دور
آج کے دور میں کوئی نہ محبت مانگے

جس کو سنگین حقائق نے کیا ہے پامال
آدمی پھر انہی خوابوں کی حرارت مانگے

جرم اوروں نے کیا اور سزا ہم کو ملی
کوئی تو اک نئی میزانِ عدالت مانگے

نہ سیاہی نہ سفیدی کی لکیریں سب کچھ
اور بھی رنگ مرا حسنِ طبیعت مانگے

9 اگست 1985

❖❖❖

غزل

یاروں نے تو جھوٹے سچے شمس و قمر کا ساتھ دیا
ہم کیوں ان کے پیچھے چلتے، اپنی نظر کا ساتھ دیا

رات کا جشن منانے والے گو اکثر پچھتاتے ہیں
وہ بھی تو شرمایا ہوگا جس نے سحر کا ساتھ دیا

دھندلی دھندلی ساری فضا ہے کیسے اس کا حال کھلے
کس نے رات کا دامن تھاما کس نے سحر کا ساتھ دیا

اول اول اس پر دو رنگی کی تہمت لگتی تھی
آخر آخر رنگ حنا نے خونِ جگر کا ساتھ دیا

اہل دنیا یہ کہلائیں، ناقدری تقدیر سنے
دیکھ کے ہم نے تنہا ان کو، اہل نظر کا ساتھ دیا

1983

❖❖❖

غزل

الفاظ میں وہ آنچ وہ تاثیر کیا ہوئی
اہل قلم کے ہاتھ میں شمشیر کیا ہوئی

موسم کی لہر، لمحے کی خوشبو کی بات ہے
لکھتے ہیں جو لہو سے وہ تحریر کیا ہوئی

دیکھو جسے وہ سایۂ دیوار میں مگن
وہ دھوپ میں تپی ہوئی توقیر کیا ہوئی

سہلا رہے ہیں اپنے ہی زخموں کو ہم نفس
خون جگر کے نقش کی تعمیر کیا ہوئی

خاشاک سوز، شعلۂ برہم کہاں گیا
آتش نفس وہ گرمیِ تقریر کیا ہوئی

سہمے ہوئے خیال ہیں ٹھٹھرے ہوئے سوال
جو منہ سے بولتی تھی وہ تحریر کیا ہوئی

لنگر نہ بادباں ہے، سفینہ رواں سہی
طوفاں کو آزمانے کی تدبیر کیاہوئی

1984

❖❖❖

غزل

خرد کے قافلے خلوت گہہ دل تک نہیں آتے
بھٹکتے ہیں مسافر اپنی منزل تک نہیں آتے
لہو سے جو لکھے جاتے ہیں نوکِ خار صحرا پر
وہ افسانے کبھی بزم عنا دل تک نہیں آتے
بھرے بازار میں ان کی سیاست خوب چلتی ہے
یہ لفظوں کے مداری کوچۂ دل تک نہیں آتے
ستمگر کو گدازِ قلب سے نسبت نہیں ہوتی
کسی بسمل کے نالے بزم قاتل تک نہیں آتے ؟
سرور آداب مستی کا تقاضا ان سے کیا کیجئے
کہ رندوں کو ابھی آدابِ محفل تک نہیں آتے

972

❖❖❖

غزل

جنہیں خبر نہیں طوفاں کی زندگی کیا ہے
انہیں ہمارے تلاطم سے آگہی کیا ہے
بس ایک موج تبسم، بس اک فریب نشاط
خزاں نصیب بہاروں کی زندگی کیا ہے
نظر کا رنگ کہ ان کے شباب کا جادو؟
کوئی بتاؤ کہ افسونِ دلبری کیا ہے
ضرور انہیں بھی ہمارا خیال آیا ہے
یہ آج چشم تصور میں روشنی کیا ہے
ہمیں عزیز خلش انتظار پیہم کی
تمہارے وعدۂ فردا کی دلکشی کیا ہے
ہوئی تمہارے تبسم کی چاندنی سے حسیں
وگرنہ میری نظر کی بساط ہی کیا ہے
بلائے عرصۂ ظلمات وسعی آب حیات
سرور اس کے سوا اپنی زندگی کیا ہے

❖❖❖

غزل

آدمی اپنا ہی دشمن ہے کوئی اور نہیں　　خود چراغ تہہِ دامن ہے کوئی اور نہیں
یہ جو ہے شیخ و برہمن کا ثناخواں اتنا　　کشتۂ شیخ و برہمن ہے کوئی اور نہیں
جس کو دعوے ہیں نگہ داری گلشن کے بہت　　خود ہی غارت گر گلشن ہے کوئی اور نہیں
جس کو کہتے ہیں مسیحا وہی قاتل تو نہیں　　راہبر آپ ہی رہزن ہے کوئی اور نہیں
چین صحرا میں نہ گلشن میں مجھے لینے دیا　　میرا دل ہی میرا دشمن ہے کوئی اور نہیں
دل جو پرواز کی لذت کا پرستار رہا　　وہی پابند نشیمن ہے کوئی اور نہیں
سلسلے جس کے بھلا دیتے ہیں سب زیست کے نقش　　آپ کا گیسوئے پرفن ہے کوئی اور نہیں

❖❖❖

متفرقات

جب اتر جائے رگوں میں زہرِ غم کا نیشتر — حسن کی پرسش بھی اکثر کارگر ہوتی نہیں
بس گیا آنکھوں میں جس کی یادِ ماضی کا غبار — حال کے آشوب پر اس کی نظر ہوتی نہیں
یاد آتا ہے کوئی صحنِ چمن یا بامِ دوست — آسمانوں پر بھی عرصے تک بسر ہوتی نہیں

❖❖❖

بازار کا سہارا کب ان کا شرف رہا — بس ایک کاروبار جنوں سے شغف رہا
یاروں کا رخ اگرچہ رہا اپنی سمت میں — ہم جانتے ہیں دھیاں مگر کس طرف رہا

2000

کہیں تو کس سے کہیں اس سفر کا حاصل کیا — ہمیں تلاش ہے اپنی تلاشِ منزل کیا

❖❖❖

جاتے جاتے کہے جاتے ہیں پھول کے خواب نہ چنیے گا — پھول تو کیا ہاتھ آئیں گے ہاں برسوں کانٹے چنیے گا
کاری گر ہوں بازی گر ہوں ہر ہر موڑ پہ ملتے ہیں — سچی بات اگر سننا ہو ہم سے آ کر سنیے گا
چلتے پھرتے دل کی باتیں سر سے گزر بھی جاتی ہیں — دھیان لگا کر سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا
کون بچا ہے شہر میں جو چھلنی نہیں تیری باتوں سے — پیرِ فلک کو بزمِ فلک کو جا کر چنیے گا

فطرت کا سمجھنا آساں ہے، انساں کا سمجھنا مشکل ہے — ظاہر کا نظارہ خوب سہی، باطن میں اترنا مشکل ہے

❖❖❖

بہار سایۂ گل میں جو مستِ خواب رہی
تو خارِ دشت کی حسرت کو کون دیکھے گا
پسند آئی جو یاروں کو صرفِ گل چینی
تو باغبانیٔ فطرت کو کون دیکھے گا

نئے منظر بھی اب کتنے پرانے ہوتے جاتے ہیں   حقائق چند لمحوں میں فسانے ہوتے جاتے ہیں

❖❖❖❖

فیض سے ان کے طبیعت میں روانی آگئی   معجزہ کہئے کہ پیری میں جوانی آگئی
داستانِ دردِ دنیا کی سنانی تھی ہمیں   یاد رہ رہ کر وہی اپنی کہانی آگئی

بھری بہار میں کوئی کمی سی لگتی تھی   ترے بغیر عجب تشنگی سی لگتی تھی
اگرچہ تیری جدائی کے دن گزار دیے   ہر ایک چیز مگر اجنبی سی لگتی تھی

❖❖❖❖

چار آنکھیں ہوں تو بجلی سی چمکتی ہے ضرور
نیچی نظروں کی گھٹاؤں میں دیے اور بھی ہیں
گو جوانی کی ترنگوں میں نشہ ہوتا تو ہے
پختہ کاری کی بسیرت میں مزے اور بھی ہیں

❖❖❖❖

فیض اک نظر کا ہے نوک ایک نشتر کی   یوں سرور ہم کیا ہیں، کیا ہماری تحریریں

❖❖❖❖

اٹے ہیں گرد سے دن ان کی تلخی ہی کو کیوں دیکھیں
شفق کو دل میں رکھ لیں شام کا سوزِ دروں دیکھیں
غزالِ شہر تو اب اپنی وحشت کھو چکا یارو
چلیں اک گاؤں کی گوری کا بے پروا فسوں دیکھیں

❖❖❖❖

بس ایک دھن میں گزاری ہے زندگی ہم نے
کسے خبر کہ خوشی کیا ہے اور غم کیا ہے

جو پایا ہے خوشی اس کی تو کم ہے
جو کھویا ہے اسی کا مجھ کو غم ہے

وہ جو خوابوں کا نشہ تھا کھو گیا
صرف یادوں کی خلش باقی رہی

زیرِ تنہائی کے ہنگامۂ محفل کا ہو قہر
بوجھ دونوں کا اٹھانا ہے اٹھاتے رہیے

اک لذت ستم کے ستائے ہوئے ہیں
اس شعلہ خو سے شکوۂ بیداد کیا کریں

یہ ہزاروں سال کا جانور جو سوار ذہن بشر پہ ہے
اسے کس طرح کریں زیر ہم یہی آج کا جہاد ہے

نئے منظر بھی اب کتنے پرانے ہوتے جاتے ہیں
حقائق چند لمحوں میں فسانے ہوتے جاتے ہیں

❖❖❖

فیض کیا رخصت ہوئے ایک دور رخصت ہو گیا
شعر کا جادو گیا، نغمے کی رعنائی گئی

آج ہے اپنی خلش اپنا نشہ اپنی نجات
دوسروں کے درد کی جو تھی پذیرائی گئی

❖❖❖

ہماری بزم میں ہے بے دلی کی دھند بہت
دلوں کی آنچ سے اس دھند میں شگاف کریں

❖❖❖

فیض سے ان کے طبیعت میں روانی آگئی
معجزہ کہیے کہ پیری میں جوانی آگئی

داستان دردِ دنیا کی سنانی تھی ہمیں
یاد رہ رہ کر وہی اپنی کہانی آگئی

❖❖❖

بھری بہار میں کوئی کمی سی لگتی تھی
ترے بغیر عجب تشنگی سی لگتی تھی

اگرچہ تیری جدائی کے دن گزار دئے
ہر ایک چیز مگر اجنبی سی لگتی تھی

❖❖❖